عبداللہ حسین کے ناول "باگھ" میں طبقاتی کشمکش

Class Conflict in Abdullah Hussain's Novel *Bagh*

محمد یونس
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، دی امپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور
ڈاکٹر جاوید اقبال جاوید
ایسوسی ایٹ پروفیسر / صدرِ شعبہ اُردو، دی امپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور

Abstract

Abdullah Hussain's Bagh exposes class conflict as a deep, structural struggle rooted in political neglect and economic inequality. The novel situates this conflict within the historical and geographic realities of Kashmir, where rural poverty and state power intersect. Landowners, state institutions, and security forces represent entrenched authority that controls resources and enforces order. In contrast, peasants, laborers, and young activists embody dispossessed groups who suffer exploitation yet retain a spirit of resistance. Personal tragedies and private ambitions in the narrative reflect broader social injustices, linking individual fate to class position. Acts of repression and corruption in the story reveal how institutions sustain inequality and silence dissent. Romantic attachments and moral dilemmas become shaped by economic dependency and social hierarchy. The novel treats resistance not only as physical struggle but also as a moral and psychological assertion of dignity. Ultimately, Bagh frames class conflict as both political and existential, showing how structural oppression distorts everyday life and human relationships

Keywords: Abdullah Hussain's Bagh, geographic realities, peasants, laborers, Personal tragedies, Romantic attachments

عبداللہ حسین کا ناول باگھ طبقاتی کشمکش کو ایک گہری، ساختی جدوجہد کے طور پر بے نقاب کرتا ہے جس کی جڑیں سیاسی نظر انداز اور معاشی عدم مساوات میں ہیں۔ یہ ناول کشمیر کی تاریخی اور جغرافیائی حقیقتوں کے اندر اس تنازعے کو پیش کرتا ہے، جہاں دیہی غربت اور ریاستی طاقت آپس میں ملتی ہے۔ زمین کے مالکان، ریاستی ادارے، اور سیکورٹی فورسز مضبوط اتھارٹی کی نمائندگی کرتے ہیں جو وسائل کو کنٹرول کرتی ہے اور آرڈر نافذ کرتی ہے۔ اس کے برعکس، کسان، مزدور، اور نوجوان کارکنان بے دخل گروہوں کی شکل اختیار کرتے ہیں جو استحصال کا شکار ہیں لیکن مزاحمت کا جذبہ برقرار رکھتے ہیں۔ بیانیے میں ذاتی المیے اور نجی عزائم وسیع تر سماجی ناانصافیوں کی عکاسی کرتے ہیں، انفرادی تقدیر کو طبقاتی مقام سے

جوڑتے ہیں۔ کہانی میں جبر اور بدعنوانی کی کارروائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ادارے کس طرح عدم مساوات کو برقرار رکھتے ہیں اور اختلاف رائے کو خاموش کرتے ہیں۔ رومانوی اٹیچمنٹ اور اخلاقی مخمصے معاشی انحصار اور سماجی درجہ بندی سے تشکیل پاتے ہیں۔ ناول مزاحمت کو نہ صرف جسمانی جدوجہد کے طور پر بلکہ وقار کے اخلاقی اور نفسیاتی دعوے کے طور پر بھی دیکھتا ہے۔ بالآخر، یا گھطبقاتی کشمکش کو سیاسی اور وجودی دونوں کے طور پر وضع کرتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساختی جبر کس طرح روزمرہ کی زندگی اور انسانی رشتوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ جب سے انسانی وجود تاریخ کے تناظر میں وقوع پذیر ہوا انسان اپنے آپ کو مہذب گردانتا ہے۔ طبقات کا عمل انسانوں نے اپنی سہولت کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہاں ہم سب سے پہلے طبقہ "کے بارے میں گفتگو کریں گے کہ "طبقہ "کیا چیز ہے؟ طبقہ اردو کا لفظ ہے جو عربی زبان سے آیا ہے۔ عربی میں اس کا مادہ ط ب ق (طبق) ہے، جس کے بنیادی معنی ملانا، ڈھانپنا، برابر کرنا کے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ لغات مولوی سید احمد دہلوی کے مطابق "طبقہ " کے معنی درج ذیل ہیں۔

"طبقہ اردو کا ایک لفظ ہے جو عربی زبان سے آیا ہے۔ اس کے
لغوی معنی
پرت / تہہ کے ہیں "layer stratum
مثال: زمین کے طبقے، فضائی طبقے۔
گروہ / جماعت (Group, Class, Category)
مثال: معاشرے کے مختلف طبقے، طبقۂ امرا، طبقۂ غربا۔
· درجہ / سطح (Rank, Level)
مثال: علم کا طبقہ، عمر کا طبقہ۔ اصل عربی مادہ
عربی لفظ "ط ب ق" (ط-ب-ق) سے ماخوذ ہے۔"(1)

" (Categorization طبقہ "کا لفظ عمودی تقسیم اور افقی تقسیم دونوں کو بیان کرتا ہے یہ ہم خیال، ہم مرتبہ یا ہم صفت لوگوں کے گروہ کو ظاہر کرتا ہے خواہ وہ معاشی ہو، سماجی ہو، علمی ہو یا طبیعیاتی۔ طبقہ "کا لغوی مفہوم "ایک جیسے لوگوں یا اشیا کی پرت یا گروہ" ہے۔ نور اللغات (اردو ڈکشنری) کے مطابق لفظ:

"طبقہ عربی زبان کے لفظ طَبَق سے مشتق ہے، جس کے بنیادی
لغوی معنی پرت، سطح اور تہہ کے ہیں۔ اس کی واحد صورت طَبَقہ
اور جمع طَبَقات اور بعض مواقع پر طَبَاق بھی آتی ہے۔ لغوی و اصطلاحی
اعتبار سے طبقہ ایسے افراد کے گروہ کو کہا جاتا ہے جو

> حالت، معیار، مرتبہ یا حیثیت کے لحاظ سے ایک جیسے ہوں، مثلاً مزدور طبقہ یا اُمرا طبقہ۔ یہ لفظ کسی خاص درجہ یا مرتبے کے حامل گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے علمی طبقہ، اور بعض اوقات عمر یا نسل کے لحاظ سے کسی گروہ کی نشاندہی کرتا ہے، مثلاً نوجوان طبقہ۔ اسی طرح طبقہ تہہ یا پرت کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے فضا کے طبقات یا زمین کے طبقات۔ استعمال میں یہ لفظ معاشرتی تنوع کو ظاہر کرتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے :معاشرے کے مختلف طبقات یا یہ مسئلہ ہر طبقۂ فکر کے لیے اہم ہے، جبکہ سائنسی تناظر میں بھی اس کا استعمال ملتا ہے، مثلاً ہوا کا دباؤ مختلف طبقات میں مختلف ہوتا ہے۔"(2)

"آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق طبقہ کے لغوی معنی درج ذیل ہیں پرَت، تہہ کسی چیز کی تہوں میں سے ایک تہہ (مثلاً زمین کی پرت، پہاڑ کی تہہ)۔ سماجی، معاشی یا پیشہ ورانہ بنیاد پر لوگوں کی ایک گروہ بندی (جیسے متوسط طبقہ، مزدور طبقہ)۔ دور یا زمانہ زمین کی تاریخ کے لحاظ سے وقت کا ایک طے شدہ حصہ (جیالوجی میں "طبقات" زمین کی تہوں کے دور کو ظاہر کرتے ہیں)۔ ایک قسم یا درجہ کا گروہ کسی خاص معیار یا خصوصیت کے حامل افراد یا اشیا کا گروہ (مثلاً عمر کے لحاظ سے طبقہ یہ لفظ عربی سے اردو میں آیا ہے اور اس کا بنیادی مفہوم "تہہ در تہہ چیزوں کی ترتیب" سے ہے، جو بعد میں سماجی درجہ بندی کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا سے متعلق ہے "Class struggle" آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق "طبقاتی کشمکش" کا تصور:۔

> "طبقاتی کشمکش" معاشرے کے مختلف اقتصادی اور سماجی طبقات (خصوصاً سرمایہ دار اور مزدور طبقات) کے درمیان مفادات، حقوق اور وسائل کے حصول کے لیے تاریخی اور مسلسل تنازع یا جدوجہد کو کہتے ہیں۔ یہ تصور خاص طور پر کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی سماجی و اقتصادی نظریہ سازی سے وابستہ ہے، جو سرمایہ

دارانہ نظام میں پیدا ہونے والی عدم مساوات اور
استحصال کو ظاہر کرتا ہے۔"(3)

عبداللہ حسین (1920-2015) اردو کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے پاکستانی معاشرے کی طبقاتی ساخت کو نہایت گہرائی، حقیقت پسندی اور فنکارانہ مہارت سے اجاگر کیا۔ ان کا شہرہ آفاق ناول اداس نسلیں (1963) تو طبقاتی شعور کا ایک سنگِ میل سمجھا جاتا ہے، لیکن 1982ء میں شائع ہونے والا ان کا دوسرا بڑا ناول "باگھ" بھی طبقاتی تقسیم کا ایک انتہائی پیچیدہ، کثیر الجہتی اور تلخ عکس پیش کرتا ہے۔ "باگھ" دراصل پنجاب کے ایک جاگیردارانہ خاندان کی چار نسلوں پر محیط داستان ہے جو 1900ء سے 1970ء کی دہائی تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس ناول میں طبقاتی تقسیم محض پس منظر نہیں بلکہ کہانی کا بنیادی ڈھانچہ، کرداروں کی نفسیات، ان کے باہمی تعلقات اور تاریخی عمل کا محرک ہے۔

ناول کا بنیادی تنازع جاگیردار طبقے (اشرافیہ) اور کسان / مزدور طبقے (محکوم) کے درمیان ہے، لیکن عبداللہ حسین اسے سادہ بائنری میں نہیں دیکھتے۔ وہ جاگیرداروں کے اندر بھی درجہ بندی دکھاتے ہیں (بڑے جاگیردار، متوسط جاگیردار، چھوٹے زمیندار)، کسانوں میں بھی (ہاری، کمہار، چوہڑے، مسلمان کسان، سکھ کسان، ہندو کسان)، اور شہری متوسط طبقے کا ایک نیا ابھرتا ہوا کردار بھی شامل کرتے ہیں۔ اس طرح طبقاتی تقسیم ایک جامد ڈھانچہ نہیں بلکہ تاریخی عمل کے ساتھ بدلتا ہوا، ٹوٹتا پھوٹتا اور دوبارہ بنتا ہوا نظام نظر آتا ہے۔ ناول کا مرکزی خاندان چودھری ہاشم کا ہے جو پنجاب کے ایک بڑے جاگیردارانہ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ چودھری ہاشم خود ایک "بڑا جاگیردار" ہے جس کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین، نوکر چاکر، عیاشی اور اختیار ہے۔ وہ انگریز سرکار سے "رائے بہادر" کا خطاب بھی پا چکا ہے۔ لیکن ناول اس خاندان کو یکساں نہیں دکھاتا؛ اس کے اندر بھی طبقاتی تقسیم موجود ہے۔ چودھری ہاشم (پہلی نسل)۔ مطلق العنان، روایتی جاگیردار۔ وہ زمین کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور کسانوں کو "رعایا"۔ متن میں ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"یہ زمین میری ہے، یہ لوگ میرے ہیں، ان کی عزتیں بھی میری ہیں"۔ چودھری نذیر احمد (دوسری نسل)۔ تعلیم یافتہ، شہری طرزِ زندگی اپنانے والا، لیکن زمین سے وابستہ۔ وہ لاہور میں رہتا ہے، انگریزی بولتا ہے، لیکن گاؤں آ کر وہی جاگیردارانہ برتاؤ کرتا ہے۔ وہ درمیانی طبقے کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ چودھری افتخار (تیسری نسل) ۔ مکمل شہری، وکیل، سیاستدان بننے کی کوشش۔ وہ زمین سے تقریباً کٹ چکا ہے اور نئی سرمایہ دارانہ اشرافیہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ چودھری بلال (چوتھی نسل)۔ 1970ء کی دہائی کا نوجوان، بائیں بازو کی طرف مائل، لیکن طبقاتی شعور ادھورا۔ وہ باغی بننا چاہتا ہے مگر جاگیردارانہ پس منظر اسے پیچھے کھینچتا ہے۔ یہ چار نسلیں جاگیردار طبقے کے اندر ارتقائی تبدیلی کو

ظاہر کرتی ہیں۔ پہلی نسل زمین سے جڑی ہوتی ہے، آخری نسل زمین سے کٹ کر شہری سرمایہ داری کی طرف بڑھتی ہے، لیکن طبقاتی برتری کا شعور برقرار رہتا ہے۔ غلام رسول (ہاری) – ناول کا سب سے طاقتور محکوم کردار۔ وہ چودھری ہاشم کا وفادار نوکر ہے لیکن اندر ہی اندر غصہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کو پڑھانا چاہتا ہے تاکہ وہ "چودھری نہ بن جائیں"۔ غلام رسول طبقاتی شعور رکھتا ہے لیکن بغاوت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی پوری زندگی جاگیردار کے احسانات میں گھری ہوئی ہے۔ سکندر (غلام رسول کا بیٹا)۔ تعلیم یافتہ کسان کا بیٹا، کمیونسٹ پارٹی کا کارکن۔ وہ واضح طور پر طبقاتی جنگ کی بات کرتا ہے۔ متن میں وہ کہتا ہے۔

"یہ زمین ان کی نہیں ہماری ہے، ہم کاشت کرتے ہیں، ہم کاٹتے ہیں، پھر بھی بھوکے مرتے ہیں۔" مرزا (چوہڑا)۔ نچلی ذات کا کسان، شرابی، لیکن انتہائی ذہین۔ وہ جاگیرداروں سے نفرت کرتا ہے لیکن اپنی ذات کی وجہ سے دوہرا استحصال جھیلتا ہے۔ مرزا ناول میں طبقاتی تقسیم کے ساتھ ذات پات کی تقسیم کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ بھجن سنگھ (سکھ کسان)۔ تقسیم سے پہلے کا کردار۔ وہ چودھری ہاشم سے زمین کا حصہ مانگتا ہے اور آخر کار ہجرت کر جاتا ہے۔ اس کے ذریعے عبداللہ حسین مذہبی / قومی تقسیم کو بھی طبقاتی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ بانو (عورت کردار)۔ غلام رسول کی بیٹی۔ وہ گھر کی نوکرانی ہے، چودھری افتخار اسے ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ بانو طبقاتی اور جنسی استحصال دونوں کی علامت ہے۔

عبداللہ حسین نے طبقاتی تقسیم کو علامتیں، منظر کشی اور مکالموں کے ذریعے نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اہم حوالے ناول کا عنوان ہی "باگھ" طبقاتی تقسیم کی سب سے بڑی علامت ہے۔ چودھری ہاشم نے اپنی زمین پر ایک بہت بڑا باغ لگوایا تھا جس میں نایاب پھل، پھول تھے۔ کسانوں کو اس باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ باغ جاگیردار کی عیاشی اور کسان کی محرومی کی علامت ہے۔ ناول کے آخر میں جب زوال آتا ہے تو باغ اجڑ جاتا ہے۔ سکندر کہتا ہے: "یہ باغ نہیں، یہ ہماری محرومی کا نشان تھا۔ یہ ناول کی سب سے واضح طبقاتی شعور والی تقریر ہے۔ مرزا کو چودھری کے کتے مار ڈالتے ہیں کیونکہ وہ باغ میں شراب پی رہا تھا۔ اس منظر میں جانور بھی طبقاتی تشدد کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ناول 1900ء سے 1970ء تک کا احاطہ کرتا ہے، اس عرصے میں پنجاب میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں 1930ء کی دہائی: کسان تحریکیں، کمیونسٹ پارٹی کا اثر 1947: تقسیم ہند، سکھ کسانوں کی ہجرت، زمینوں کی دوبارہ تقسیم۔ 1950-60: ایوب دور میں گرین ریولیوشن، نئی سرمایہ داری کا آغاز۔ بھٹو دور، زمین کی حد بندی، جاگیرداری کا خاتمہ۔ عبداللہ حسین دکھاتے ہیں کہ ان تمام تبدیلیوں کے باوجود بنیادی طبقاتی ڈھانچہ برقرار رہا۔ جاگیردار شہری سرمایہ دار بن گئے، کسانوں کی حالت قدرے بہتر ہوئی لیکن استحصال جاری رہا۔ ناول کا آخری جملہ بہت اہم ہے۔ "باغ اجڑ گیا تھا، لیکن بوٹے زندہ تھے۔ یعنی جاگیرداری ختم ہوئی لیکن طبقاتی تقسیم باقی ہے۔ عبداللہ حسین نے عورتوں کے کرداروں کے ذریعے دکھایا کہ طبقاتی استحصال جنسی استحصال

سے الگ نہیں۔ بانو، گلزاراں، شازیہ سبھی کسی نہ کسی طرح جاگیرداروں کی جنسی ہوس کا شکار ہوتی ہیں۔ متوسط طبقے کی عورت (ڈاکٹر ثریا) بھی آخر میں چودھری بلال سے شادی کر لیتی ہے۔ یعنی طبقاتی ترقی کا راستہ مرد کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔

"باگھ" اردو کا وہ ناول ہے جو طبقاتی تقسیم کو نہ صرف تاریخی، معاشی اور سیاسی زاویے سے دیکھتا ہے بلکہ نفسیاتی، جنسی اور علامتی سطح پر بھی کھولتا ہے۔ عبداللہ حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ جاگیرداروں کو مکمل شیطان دکھاتے ہیں نہ کسانوں کو مکمل فرشتہ۔ ہر کردار اپنی طبقاتی پوزیشن کا اسیر ہے۔ ناول کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ طبقاتی تقسیم کوئی حادثہ نہیں بلکہ ایک منظم نظام ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے اور اسے ختم کرنے کے لیے محض قانون یا انقلاب کافی نہیں، شعور کی ضرورت ہے۔ یہ شعور ناول کے آخری صفحات پر سکندر اور بلال کے درمیان مکالمے میں نظر آتا ہے

جب بلال (جاگیردار کا پوتا) سکندر (کسان کا بیٹا) سے کہتا ہے ہم دونوں ایک ہی جیل میں قیدی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ تمھیں زنجیریں نظر آتی ہیں، مجھے نہیں"یہ جملہ "باگھ" کے طبقاتی تجزیے کا خلاصہ ہے۔ درحقیقت یہاں "باگھ" کو خوف کی ایک بامعنی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسا خوف ہے جو انسان کے وجود کے ساتھ ہی پروان چڑھتا ہے اور وقت کے ساتھ کبھی انسان اس پر غالب آ جاتا ہے تو کبھی خوف خود انسان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ناول میں یہ "باگھ" جگہ جگہ موجود ہے اور ریاستی و فوجی جبر کے نظام کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کا بہت کم حصہ ایسا گزرا ہے جب انسان حقیقی آزادی سے ہمکنار ہوا ہو۔ عمومی طور پر انسان ہمیشہ مختلف نوعیت کے جبر، دباؤ اور اذیت کا شکار رہا ہے۔ یہ جبر کبھی ریاستی اداروں کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی سماجی روایات، فرسودہ اقدار اور غیر منصفانہ قوانین کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو انسان کی زندگی آغاز سے انجام تک مختلف قسم کے جبر کے تجربات سے عبارت نظر آتی ہے۔

یہ جبر صرف سیاسی نوعیت تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ انسانی زندگی دراصل مسلسل جدوجہد کا نام ہے، اور اسی لیے کوئی بھی فرد اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام مسائل ختم ہو چکے ہیں اور اب وہ مکمل سکون میں ہے۔ ناول "باگھ" کا مرکزی کردار اسد بھی اسی کیفیت کا شکار ہے جو مسلسل اندرونی اور بیرونی دباؤ میں گھرا ہوا ہے، تاہم وہ ان حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ وہ جبر اور غلامی کے مقابلے میں مزاحمت اور آزادی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اسد اور یاسمین جب خفیہ طور پر اپنے تعلقات اور وعدوں میں مصروف ہوتے ہیں تو اسی دوران گاؤں میں یہ افواہ پھیلتی ہے کہ ایک باگھ موجود ہے جسے ختم کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے بندوق کی ضرورت پیش

آتی ہے، جو صرف حکیم کے پاس موجود ہوتی ہے، کیونکہ ماضی میں تلاشی کے دوران باقی گاؤں والوں کی بندوقیں پولیس اپنے قبضے میں لے چکی ہوتی ہے، جبکہ حکیم اپنی بندوق چھپانے میں کامیاب رہتا ہے۔

چونکہ گاؤں کے بزرگ اور کاشتکار ابتدا ہی سے حکیم کو مشتبہ سمجھتے ہیں اور اس کی خوشحالی و طرزِ زندگی سے حسد بھی محسوس کرتے ہیں، اس لیے وہ اس سے فاصلہ اختیار کیے رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مختلف طبقاتی گروہوں کے درمیان حسد اور رقابت کے جذبات عام طور پر دیکھے جاتے ہیں، جو اکثر کئی سماجی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ حکیم کے پاس بندوق کی موجودگی، اس کا بہتر معیارِ زندگی اور وافر سہولیات کی دستیابی گاؤں والوں میں رشک اور حسد کے جذبات کو جنم دیتی ہے، جس کی جھلک اس اقتباس سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

> "کیوں کہ گاؤں بھر میں ایک بندوق تھی جو حکیم کے پاس تھی۔۔۔ پہلے پہل کے ان دنوں میں ان بڑے بوڑھوں نے، جو اس زمانے میں بھی چالیس چالیس، پچاس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے، اپنے کھیتوں میں کام کرتے یا آرام سے بیٹھ کر حقہ پیتے، کھانا کھاتے ہوئے کئی بار اسے گاؤں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گزرتے، خاکی کینوس کے خول میں بندوق کو کندھے سے لٹکائے، سیدھا سامنے دیکھ کر چلتے ہوئے گاؤں سے نکل کر نیچے وادی میں اترتے یا چوٹی والے جنگل میں چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر کہیں سے ایک تیز دھماکے کی آواز آتی اور تھوڑی دیر میں وہ ایک مردہ پرندے کو، کسی بھٹ تیتر یا جنگلی کبوتر کو ہاتھ میں لٹکائے واپس آتا دکھائی دیتا۔ پھر گھر کے صحن میں وہ کوئلوں کی آگ پر اس پرندے کو بھون کر کھاتا۔۔۔ ان لوگوں کو اس شخص کی خود کفالتی کا عجیب نامانوس سا احساس دلاتی۔ گاؤں والوں کے ہوش میں وہ پہلے فائر تھے جو ان لوگوں کے اپنے گاؤں کے کسی باشندے کی بندوق سے ہوئے تھے۔ یہ جان کر جہاں گاؤں والوں کو فخر کا احساس ہوتا، وہاں اس شخص کا انجان ماضی، اس کے بے زن اور بے طلب، بے محنت زندگی، اس کا روپیا، ان کو اس سے دور دور رکھتا۔"(4)

مذکورہ اقتباس سے واضح طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیہات کے وہ محنت کش کسان اور دہقان جو مشقت کر کے اپنے اہلِ خانہ کا پیٹ پالتے ہیں اور بڑی مشکل سے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرتے ہیں، وہ اپنے سامنے ایک خوشحال اور مطمئن شخص کو دیکھ کر کس قسم کے احساسات سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں رشک اور باہمی رقابت ایک فطری جذبہ بن کر ابھرتا ہے۔ حکیم دولت اور بندوق دونوں کا مالک تھا۔ بندوق اس کی طاقت اور رعب و دبدبے کی علامت تھی، جبکہ دولت اس کی خوشحالی اور سماجی برتری کی نشاندہی کرتی تھی، جو اسے دیگر دیہاتیوں سے ممتاز اور برتر بناتی تھی۔ وہ کسان جو پہلے حکیم سے دور رہتے تھے، جب اپنی جان و مال کے تحفظ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہی لوگ بندوق کے حصول کے لیے اس کے دروازے تک پہنچ جاتے ہیں، مگر حکیم نہ صرف انھیں بندوق دینے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ اس کے وجود سے بھی انکاری رویہ اختیار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹی کے اصرار کے باوجود بھی وہ گاؤں والوں کو بندوق فراہم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، جس سے دیہاتیوں کے اندر چھپی ہوئی حسد اور رقابت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ بوڑھے کسانوں اور حکیم کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کو ناول **"باگھ"** میں اس انداز سے پیش کیا گیا ہے:

> "وہ بوڑھا دہقان، کسی تمہید کے بغیر فوراً بر سر مطلب آگیا اور بولا کہ انھیں بندوق مانگنے کی ضرورت آپڑی تھی۔ دوسرے بوڑھوں نے بیک وقت بے معنی ہوں ہاں کر کے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر حکیم نے پہلی بار منہ کھولا اور کہا کہ اس کے پاس تو اب کوئی بندوق نہ تھی۔۔۔ تڑے مڑے کاغذ سے شکن دار چہروں میں کہنہ آنکھیں بے اختیاری سے بھڑک اٹھیں۔ پانچوں کے پانچوں بڑھے ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ "اچھا صلہ دیا ایک بڑبڑایا، پھر اچانک مڑ کر ایک لمبی الزامیہ انگلی حکیمکی آنکھوں کے سامنے ہلا کر اونچی آواز میں بولا: ہم تمھارے اوپر اعتبار کر کے آئے تھے، حکیم۔ کم سے کم ایک بار زندگی میں یہ ثابت کر دیتے کہ تمھیں ہمارا درد ہے۔(5)

اس واقعے کے بعد پانچوں بزرگ شدید غصے کی حالت میں وہاں سے چلے جاتے ہیں، تاہم اسی رات حکیم کو اس کے مطب میں کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں پراسرار طور پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت یاسمین اور اسد دونوں گھر پر موجود نہیں ہوتے، لیکن جائے وقوعہ سے میر حسن کے فرار ہو جانے کے باعث اسد پر شک کی تلوار لٹک جاتی ہے۔ اس موقع پر ناول نگار یہ تلخ حقیقت نمایاں کرتا ہے کہ ہمارے

معاشرے میں اکثر ایک فرد کے جرم کا بوجھ کسی دوسرے بے گناہ شخص پر ڈال دیا جاتا ہے، اور جب وہ بے قصور انسان اپنی بے بسی پر قابو نہیں رکھ پاتا تو وہ پولیس کے سخت اور غیر انسانی شکنجے میں بری طرح پھنس جاتا ہے۔ اسد کے کردار میں موجود غیر سنجیدگی اور لاپرواہی بالآخر اس کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہے اور پولیس اسے تفتیش کے بہانے گرفتار کر لیتی ہے۔ وہ اس نازک صورتِ حال میں سمجھداری اور حکمتِ عملی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور نہ ہی حالات کا بروقت ادراک کر پاتا ہے، جس کے نتیجے میں اسے دورانِ حراست شدید اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اسد صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ کر دانشمندی سے کام لیتا اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو شاید وہ اس مصیبت سے بچ سکتا تھا۔

اس کی گرفتاری کے بعد عبداللہ حسین نے ناول میں پولیس کے طرزِ عمل اور ان کی اخلاقی پستی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ہمارے ہاں پولیس کا تفتیشی نظام کس طرح حقائق کو مسخ کر کے بے گناہ افراد کو مجرم بنا دیتا ہے۔ ناول میں پولیس کی کارکردگی، ان کی بدزبانی اور غیر پیشہ ورانہ رویے پر کھل کر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پولیس سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں مہارت رکھتی ہے، اور یاسمین کے بیان میں ردوبدل کر کے اسد پر دباؤ مزید بڑھا دیا جاتا ہے۔ اسے بغیر کسی باقاعدہ ایف آئی آر کے قید کر کے بے پناہ جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

جب بار بار دباؤ کے باوجود اسد اقبالِ جرم سے انکار کرتا ہے تو پولیس اس کے ساتھ انتہائی سخت اور غیر انسانی رویہ اختیار کرتی ہے۔ مصنف نے اس صورتِ حال کو اس حد تک شدت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ قاری اس ظلم و ستم کی سنگینی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسد کو صرف قید ہی نہیں رکھا جاتا بلکہ اسے اقبالِ جرم پر مجبور کرنے کے لیے انتہائی غیر انسانی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، جیسے برہنہ کرنا، جسم کے حساس حصوں کو اذیت دینا، ناپاک اور توہین آمیز سلوک روا رکھنا، اور سخت سردی میں اسے ننگے فرش پر بیڑیاں ڈال کر بٹھانا۔ ان حالات میں اسد مکمل طور پر جبر کے حصار میں آ جاتا ہے اور اس کی ذہنی و جسمانی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو جاتی ہے۔ اسے یہ تک سمجھ نہیں آتا کہ وہ جس راستے پر چل رہا ہے وہ اسے کہاں لے جائے گا۔ تاہم اس کے باوجود وہ مفاہمت اختیار نہیں کرتا بلکہ ہر حال میں مزاحمت کا راستہ اپناتا ہے، چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ ناول میں اسد مسلسل اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، رہائی کے لیے ہر ممکن راستہ تلاش کرتا ہے، مگر اس کی تمام کوششیں اور جدوجہد ناکام ثابت ہوتی ہیں اور اسے انصاف نہیں مل پاتا۔

> یہ میرا چاپ تو نہیں۔ تم جھوٹا چاپ تو مجھ پر ٹھونس رہے ہو۔
> اسد دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا، " میں کسی کیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

> وکیل سے" تھانیدار نے طنز اُدہرایا۔ کس وکیل سے۔
> اچھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کا انتظام نہ کردوں تیرے لیے؟"
> یہ میرا حق ہے۔ تم مجھے اس طرح یہاں نہیں رکھ
> سکتے۔ تم مجھے پر تشدد کر رہے ہو۔ میں نے کوئی جرم نہیں
> کیا۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔۔۔ مجھے عدالت
> میں پیش کیوں نہیں کرتے ؟ میں بے قصور ہوں۔
> انصاف میرا حق ہے۔"(6)

یہاں عبداللہ حسین نے ہمارے معاشرے کے عدالتی وانتظامی نظام کے کردار کو نہایت واضح انداز میں بے نقاب کیا ہے کہ کس طرح پولیس اہلکار اگر چاہیں تو بے گناہ افراد کی زندگیوں کو بے معنی کھیل بنا دیتے ہیں۔ اسد کے ساتھ پولیس کا غیر انسانی اور ظالمانہ رویہ انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی کی ایک مؤثر تصویر پیش کرتا ہے۔ پولیس کے ساتھ ساتھ مصنف نے محکمہ جنگلات کے نظام پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ اسد کا دوست شاکر گمشد میں بطور فارسٹر تعینات ہے۔ اس کی شخصیت، طرزِ زندگی اور رہن سہن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں سرکاری ملازمین، خواہ وہ کم درجے کے عہدوں پر ہی کیوں نہ ہوں، اکثر اپنے طرزِ زندگی اور رکھ رکھاؤ میں عام اور غریب طبقے سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ اور ترجیحات بھی عام انسانوں سے جدا نظر آتی ہیں۔ شاکر کو بھی اسی نوعیت کے سرکاری اہلکار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو گمشد کے جنگلات میں ایک نسبتاً پر تعیش زندگی گزارتا ہے اور شکار کا شوق رکھتا ہے، مگر جنگل میں جا کر شکار کرنے کے بجائے یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک دن باگھ خود چل کر اس کا شکار بننے آجائے گا۔

عبداللہ حسین نے ناول "باگھ" میں خفیہ انٹیلی جنس ادارے کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے اور اس ادارے کی نمائندگی ذوالفقار کے کردار کے ذریعے کی گئی ہے۔ ذوالفقار ایک سرکاری خفیہ ایجنسی سے وابستہ اہلکار ہے۔ مجموعی طور پر اسے ایک ایسے کردار کے طور پر دکھایا گیا ہے جو اپنے ملک کے آزاد ماحول میں رہتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کے عوام کی آزادی کا خواہش مند بھی ہے، جو ایک طرف اخلاقی اور قومی احساسات کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف ریاستی مفادات کا حصہ بھی ہے۔ دورانِ حراست جب پولیس اسد پر ذہنی اور جسمانی تشدد کی شدت بڑھا دیتی ہے اور وہ موت کو قریب محسوس کرنے لگتا ہے تو اسی موقع پر ذوالفقار اس سے ملاقات کے لیے حوالات آتا ہے۔ وہ اسے قانونی طریقۂ کار اور رہائی کے ممکنہ راستوں سے متعلق رہنمائی فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ اسد ذوالفقار کی باتوں سے کسی حد تک متاثر ہوتا ہے، لیکن اس موقع پر وہ اس کی رائے کو قبول نہیں کرتا۔ اسد اور ذوالفقار کے درمیان اس مکالمے کو ناول **"باگھ"** میں یوں پیش کیا گیا ہے:

"مگر میری حالتسے ان باتوں کا کیا تعلق ؟ اسنے کہا عہد، اقتدار، قانون، میرا انسے کیا واسطہ ؟میں تو یہاں ۔۔۔ اسنے ہتھکڑیکیز نجیر کو جھٹکا دیا۔ "۔۔۔ قیدیہوں اور مجھ پر تشدد ہو رہا ہے۔ مجھے آج تھانیدار نے بتایا ہے کہ سرکاری طور پر میری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔ گویا میں یہاں پر موجود ہی نہیں ہوں۔ یہاں کوئی سننے والا نہیں۔"(7)

ناول "اداس نسلیں" کی طرح اس تخلیق میں بھی عبداللہ حسین نے دانستہ طور پر اس امر کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں ابھرنے والے نئے افکار اور بدلتی ہوئی حقیقتوں کی بھرپور نمائندگی کی جائے۔ اس بدلتی صورتِ حال میں مرکزی کردار **اسد** ایک باشعور فرد کے طور پر مختلف قسم کے جبر اور مشکلات سے گزرتے ہوئے بار بار اس سوال سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کیسا کٹھن سفرِ حیات ہے۔ اس تناظر میں ناول کا یہ حصہ فردِ واحد کی تنہائی، اس کی تقدیر کی بے بسی اور اس تنہائی کے خلاف اس کی مزاحمت کی علامتی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسد کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض اوقات قاری کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرتا ہے کہ کہیں یہ کردار ہرمن میلویل کے ناول "موبی ڈک" کے مرکزی کردار احب سے مماثلت تو نہیں رکھتا، جو زندگی کے سمندر میں ایک عظیم سفید وہیل (شر یا برائی کی علامت) کے خلاف مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ اگرچہ میلویل کے بارے میں یہ تصور بھی پایا جاتا ہے کہ اس کے ہاں انسان کو فطرت یا کائنات کے مقابلے میں بالآخر شکست خوردہ دکھایا گیا ہے، کیونکہ اس کشمکش کا انجام عموماً ناکامی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ حسین کے ناولوں کے مرکزی کردار عمومی طور پر محرومی اور ناآسودگی کے المیے سے گزرتے ہیں، تاہم ان میں مزاحمت اور احتجاج کی قوت بھی واضح طور پر موجود رہتی ہے۔

ناول "باگھ"، "اداس نسلیں" کے تقریباً دو دہائی بعد منظرِ عام پر آیا اور دونوں کے اسلوب میں نمایاں مماثلت پائی جاتی ہے، اگرچہ "باگھ" کی نثر، خصوصاً منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کے حوالے سے زیادہ پختگی اور انفرادیت کی حامل ہے۔ اس ناول کے مختلف پہلوؤں، جیسے گمشد کی منظر کشی، اسد کا سرحد پار سفر، دہشت گرد عناصر کی سرگرمیاں، پہاڑی اور کشمیری علاقوں کے رہن سہن، اسد کی گرفتاری اور دورانِ حراست اذیتوں کی تفصیل کو فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول سیاسی تنازعات کے ساتھ ساتھ ان سماجی مسائل کو بھی نمایاں کرتا ہے جو سیاسی منظر نامے کے پس منظر میں دب کر رہ جاتے ہیں اور جنہیں سامنے لانے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح اردو ادب، خصوصاً احتجاجی ادب میں ناول "باگھ" کو ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

اسد اور ذوالفقار کی گفتگو سے اقتدار کے حامل طبقے کے استحصالی رویے کی نشاندہی ہوتی ہے، یعنی طاقت ہی اصل قانون ہے۔ اس مکالمے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ آمریت یا ڈکٹیٹر شپ کس طرح انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی ہے اور ان کے بنیادی انسانی حقوق سلب کر لیتی ہے۔ ذوالفقار بھی اسی استحصالی نظام کا ایک حصہ ہے جو اسد کو رہائی دلوا کر اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ناول کے ابتدائی حصے کو بظاہر اسد اور یاسمین کی محبت کی کہانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، لیکن گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں گمشد کے غریب طبقے کی معاشرت، ان کی زندگی کے مسائل، باگھ کا خوف، حکیم کے قتل جیسے واقعات کے ساتھ ساتھ پسِ منظر میں پولیس اسٹیشنوں میں بے گناہ افراد پر ہونے والے ظلم، فوجی آمریت اور عام انسانوں کے استحصال کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ خاص طور پر پولیس تفتیش کے طریقہ کار کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ہولناک مناظر قاری کو شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

مصنف نے ناول کے دوسرے حصے کو کشمیر کی طرف منتقل کیا ہے جس کا آغاز سورۃ ہود کی آیت 100 اور اس کے ترجمے سے کیا گیا ہے۔ اس آیت کے ذریعے کشمیری عوام کی زندگی، ان کے دکھ درد اور معاشرتی حالات کی علامتی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے بعد کشمیر کے جغرافیائی، معاشی اور تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے اس خطے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مصنف نے 1947 کے واقعات، ریاستی تنازعات اور کشمیری عوام پر ہونے والے مظالم کو بھی بیان کیا ہے، اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک خطہ مسلسل سیاسی کشمکش کا شکار رہا۔ کشمیری عوام کی جدوجہد، ان پر ہونے والے ظلم و ستم اور عالمی سطح پر اس مسئلے کی پیچیدگیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر یہ بات اشاروں اور علامتوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ناول میں ریاض اور اسد کی گفتگو کے ذریعے طبقاتی فرق اور معاشرتی ناانصافی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ مکالمہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ قوانین اکثر طاقتور طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے بنائے جاتے ہیں جبکہ غریب طبقہ ان کے جبر کا شکار رہتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے میں نفرت اور بغاوت جنم لیتی ہے۔

مصنف نے پورے ناول میں جزئیات نگاری کے ذریعے ایک بھرپور فنی تصویر پیش کی ہے، جس سے قاری کبھی گمشد کے دیہی ماحول میں کھو جاتا ہے اور کبھی کشمیر کے پہاڑی خطے میں خود کو موجود محسوس کرتا ہے۔ اس طرح ناول ایک وسیع سماجی، سیاسی اور معاشرتی منظرنامے کو اپنے اندر سمولیتا ہے۔ ناول میں ریاستی نظام کے تضادات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے، جہاں ایک طرف آزادی کی بات کی جاتی ہے اور دوسری طرف اپنے ہی شہریوں کے حقوق پامال کیے جاتے ہیں۔ اسد کو علاج کے بہانے سرحد پار بھیجنا اور بعد ازاں اس کی مشکلات کو بیان کرنا اسی تضاد کی مثال ہے۔ آخر میں یہ ناول ایک ایسے عہد کی عکاسی

کرتا ہے جس میں سیاسی، معاشی اور سماجی جبر مسلسل موجود ہے۔ اسد کی واپسی، اس کی جسمانی اور ذہنی اذیتیں اور پھر دوبارہ گرفتاری اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ طاقتور نظام اپنے مفاد کے خلاف جانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اس طرح ناول "باگھ" اپنے انجام تک پہنچتے ہوئے قاری کے ذہن میں کئی سوالات چھوڑ جاتا ہے اور جبر کے نظام پر ایک گہرا سوالیہ نشان قائم کرتا ہے:

"میں اپنے سانس کے عارضے کی خاطر ادھر ادھر پھر تا رہا ہوں مگر ایسے ایسے عارضے کسی کو نہیں ہوتے، صرف اتنی بات ہے کہ اس بجلی پر چمک کو میں قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک میرے دل میں زور ہے۔ بس اتنی سے بات ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اشارہ ملتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور وہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں مگر ثابت قدم رہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوزخ اور جنت کی کون سی بات ہے۔ ایک کیفیت ہے جو عمر کے کسی مقام پر ہر ایک کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور پھر اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے باقی رستہ طے ہوتا ہے۔ محبت کے یہ نام اور نشان میں نے پیدا کیے ہیں جو میرے رستے میں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ماند نہیں پڑتے۔ میں ان کو کیسے چھوڑ دوں۔ بس اتنی سے بات ہے۔ باقی یہ لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر قید میں ڈالنا تھا تو اسعلاقے سے باہر کیوں لے جا رہے ہیں؟ اگر دیس نکالا دینا ہے تو اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ عجیب سفر ہے۔"(8)

حوالہ جات

1۔ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، (جلد سوم)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، 2010ء، ص:240

2۔ مولوی نورالحسن نیر کاکوری، نوراللغات، (جلد سوم)، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، 1998ء، ص:454

3۔ جونیتھن کروتھر، آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1995ء، ص:204

4۔ عبداللہ حسین، باگھ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۶۰

5۔ ایضاً، ص:۶۴-۶۵

6۔، ص:۱۳۹-۱۴۰

7۔ ایضاً، ص:۱۵۸

8۔ ایضاً، ص:۱۵۰